ابنِ صفی سے ملاقات

محمد بدر منیر

ابنِ صفی سے میں صرف دو بار ملا ہوں۔ ایک بار، اُن سے اِنٹرویو لینے کے لیے اور دوسری بار، یہ اطلاع دینے کے لیے کہ میں نے جس جریدے کے لیے یہ اِنٹرویو لیا تھا، وہ اسے شائع کرنے سے گریزاں ہے۔

دونوں بار، وہ معمول کے مطابق ملے۔ انہیں نہ اِنٹرویو کی خوشی تھی اور نہ اس کی عدم اشاعت پر ملال۔ اُن کی اس ادا نے مجھے، اُن کی شخصیت کا گرویدہ کر دیا۔ حالانکہ میری خواہش تھی کہ وہ اِنٹرویو ضرور شائع ہو... اور جب مدیر موصوف نے اس کی اشاعت سے معذوری کا اظہار کیا تو مجھے رنج ہوا لیکن ابنِ صفی سے دوسری مُلاقات کے بعد،

مجھے اس کیفیت سے نجات مل گئی اور میں ابن صفی کی اس رائے سے صد فی صد متفق ہو گیا کہ اس جریدے میں اُن کا انٹرویو فی الواقع شائع ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُنہوں نے محض مروت میں انٹرویو پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ جس مصنف کی تحریر کم از کم سات زبانوں میں، چھ، ساڑھے چھ لاکھ قارئین پڑھتے ہوں، اُسے چند سو چھپنے اور چھپ کر چھپ جانے والے جریدے میں شائع کرنا، اس کے ساتھ زیادتی ہوتی

اُنہوں نے اپنے اس انٹرویو میں ادب، کتاب، قاری اور ناشر کے بارے میں بہت سی خیال انگیز باتیں کہی تھیں جو ہمارے اس مدیر کو ناگوار گزریں اور کچھ زیادہ ہی ناگوار گزریں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے انٹرویو کا وہ مسودہ اُن سے جھپٹ لیا ورنہ وہ شاید اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ حالانکہ اُن کا اپنا جریدہ باقاعدگی کے ساتھ پنساریوں اور عطاروں کے ہاں ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔

یہ انٹرویو، ابن صفی اور اُن کے قارئین کی امانت ہے اور میں اسے علیحدہ پیش کروں گا۔ ان سطور میں ابن صفی سے وابستہ چند خوشگوار یادیں قارئین کی نذر ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ "شعلہ سیریز" سے میں نے ابن صفی کا مطالعہ شروع کیا۔ مستقل کرداروں فریدی اور حمید کے علاوہ مجھے، ڈاکٹر سلیمان نے بھی متاثر کیا اور اُن کا یہ شعر (جو ابن صفی کا شعر تھا) ایک عرصے تک میرے حافظے کی لوح پر نقش رہا ہے

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں
یوں در و دیوار سے سر کو نہ پھوڑ!

ان دنوں، میں زبردست ذہنی انتشار سے دوچار تھا اور مجھے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دے رہی تھی۔ دوستوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میری زندگی کا اختتام قریب تر ہے... لیکن "شعلہ سیریز" نے میری امنگوں اور حوصلوں کو نئی توانائی دی اور میں جلد ہی انتشار کے اس ہولناک گرداب سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

"شعلہ سیریز" کے بعد، سنجیدہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ابن صفی کی کتابوں کا مطالعہ بھی میرے لیے، دسترخوان پر چٹنی کی طرح ناگزیر ہو گیا لیکن وہ کتابیں میری الماری کی زینت نہ بن سکیں، کہ شرم آتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے... پھر یہ جھجک بھی جلد ہی ختم ہو گئی جب میں نے اپنے عہد کے نامور، شریف، دین دار، دیانت دار... مخلص سیاستدان، پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل اور وزیر اعظم الحاج خواجہ ناظم الدین کی بک شیلف میں ابن صفی کی کتابیں دیکھیں۔ خواجہ صاحب مرحوم، اگاتھا کرسٹی، سر آرتھر کانن ڈائل اور پیری میسن سیریز کے مستقل

قاری تھے... لیکن ابنِ صفی کی آمد کے بعد، انہوں نے انگریز مصنفین سے کافی حد تک نجات حاصل کرلی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے خواجہ صاحب سے ابنِ صفی کی پسندیدگی کی وجہ دریافت کی تو خواجہ صاحب نے کہا۔

"میں جاسوسی ادب کا مطالعہ ذہنی ورزش کے لیے کرتا ہوں۔ دوسری ادبی تحریروں کی طرح اس میں ذہنی آوارگی اور بدمعاشی نہیں ہوتی اور ابنِ صفی مجھے خاص طور پر اس لیے پسند ہے کہ وہ فی الواقع ایک شریف، دیانت دار، خوددار، باغیرت اور نیک نیت لکھنے والا ہے۔ لکھنے والے کی تحریر اس کے ذہن کی عکاس ہوتی ہے۔ ایک لکھنے والا اگر بدباطن ہے تو وہ لاکھ اپنی فنکاری دکھائے، اس کی بدطینتی، اس کی تحریر سے عیاں ہو جاتی ہے... مجھے اس لیے بھی ابنِ صفی پسند ہے کہ اس نے اردو ادب کو انگریزی ادب کے برابر لا کھڑا کیا ہے اور کہیں کہیں تو اس کا قد غیر ملکی لکھنے والوں کے مقابلے میں نکلتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔"

مجھے، خواجہ صاحب کے ان خیالات سے حیرت انگیز خوشی حاصل ہوئی... اور پھر ابنِ صفی کی کتاب خریدنے اور اسے پڑھنے میں مجھے کسی "بڑے ادیب" کی ناراضگی کی کوئی پروا نہیں رہی۔

میں، اُن معمر خاتون کو بھی نہیں بھول سکتا جو اردو سمجھ تو لیتی تھیں لیکن پڑھ نہیں سکتی تھیں۔ وہ، پوسٹ میڈیکل گریجویٹ میڈیکل کالج اسپتال ڈھاکہ میں زیرِ علاج تھیں۔ اُن کی عمر نوے سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ بینائی کے ساتھ ساتھ سماعت بھی کمزور پڑ چکی تھی... ایک دوست نے ڈیوٹی لگائی کہ میں روزانہ شام پانچ بجے سے سات بجے تک، اُن کی پسندیدہ اردو کتاب پڑھ کر سنایا کروں۔ میں نے یہ ڈیوٹی بلاناغہ تین ماہ تک سرانجام دی۔ اس دوران میں، میں نے اس مصنف کی ساری کتابیں پڑھ کر سُنا ڈالیں اور جب وہ کتابیں ختم ہو گئیں تو پھر پہلی کتاب سے پڑھ کر سُنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چونکہ ان خاتون کی سماعت بھی کمزور تھی، اس لیے مجھے بار بار ایک ہی... پیراگراف چیخ چیخ کر سُنانا پڑتا... کبھی کبھی بے اختیار طبیعت بیزار ہو جاتی لیکن پھر خاتون کی علالت اور بے بسی دیکھ کر مجھے اپنی بیزاری پر ندامت ہوتی۔

"پڑھائی" کے دوران، میں کبھی تھک کر دم لیتا تو وہ خاتون بستر کے ساتھ بغلی میز پر رکھے ہوئے پھلوں کی طرف اشارہ کر کے اپنی لرزتی ہوئی آواز میں بڑی شفقت کے ساتھ کہتیں۔ "بیٹا! انگور کھالو... تمہارا حلق سوکھ گیا ہے۔"

یہ سُن کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

چلتے ہوئے وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار اتنی دعائیں... دیتیں کہ دل سے آواز نکلتی کہ کاش! یہ ساری دعائیں قبول ہو جائیں

سقوطِ مشرقی پاکستان کے چند روز بعد، یہ سلسلہ منقطع ہو

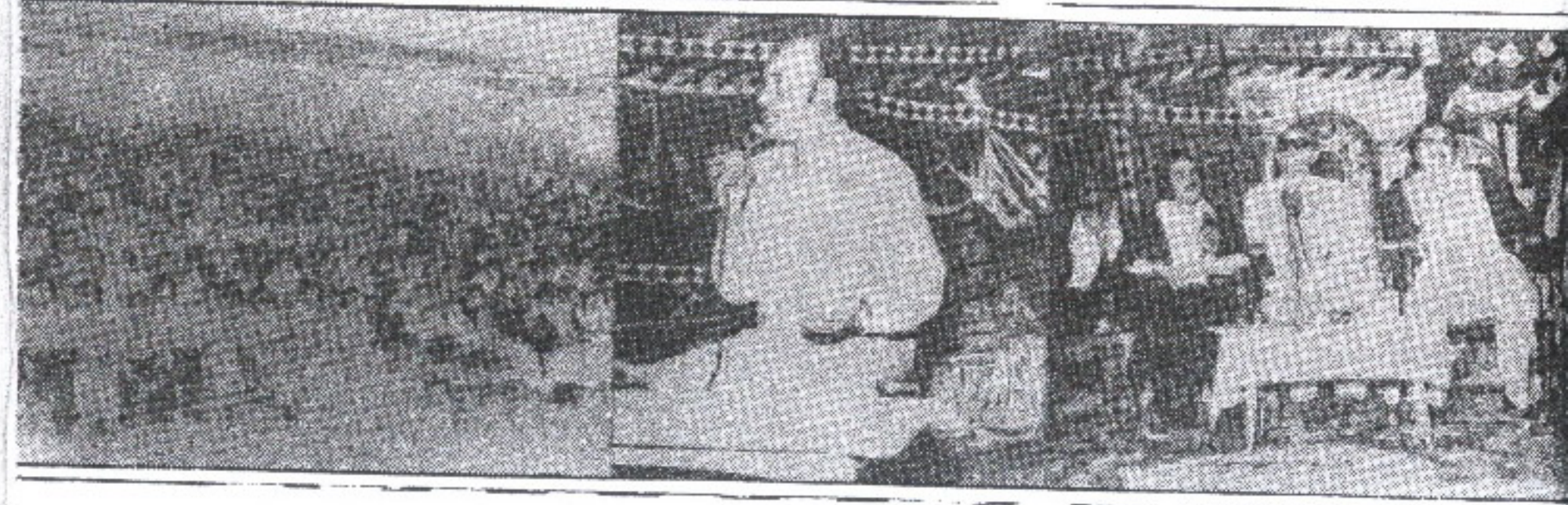

گیا تو انہوں نے میری طرف کئی لوگوں کو بھیجا لیکن میں اپنے مکان سے ایک بنگالی دوست کے ہاں منتقل ہو چکا تھا۔ بالآخر میں ہی ہمت کر کے، اُن کے پاس پہنچا تو انہوں نے بے اختیار کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو اور خیریت سے ہو۔ چلو، کتاب پڑھ کر سناؤ۔"

ان حالات میں مجھے اردو پڑھتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوئی تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔ "پڑھتے کیوں نہیں؟"

جب میں کتاب ہاتھ میں لے کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو وہ سمجھ گئیں اور کہنے لگیں۔ "تم کس سے ڈرتے ہو، پڑھو؟"

اُن کے پاس، ملاقات کے لیے آئے ہوئے لوگ بڑی... بے چینی سے "اردو" سُن رہے تھے لیکن خاتون کے خوف سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے... کیونکہ وہ خاتون کوئی اور نہیں

بابائے بنگلہ دیش کی والدہ تھیں۔

انہوں نے ابنِ صفی کو کہاں سے تلاش کیا؟ میں اس بارے میں اُن سے پُوچھنے کی کبھی جرأت نہ کرسکا۔

اُردو کے ثقہ مصنفین اور قارئین بھی ابنِ صفی کے سحر میں گرفتار تھے اور ہیں... ایک صاحب نے جو اُردو کے علاوہ، پنجابی زبان کے شعرا میں بھی سرِفہرست ہیں، ایک روز کہا:

"یار، ابنِ صفی کی تحریر میں زندگی اور شگفتگی ہے کبھی کبھی غمگین ہونے کو بھی دل چاہتا ہے اور یہ کیفیت بھی ابنِ صفی کی تحریروں میں پائی جاتی ہے لیکن یہ کیفیت فطری ہے۔ اس سے ذہن پر یاسیت سوار نہیں ہوتی کہ خوشی کا احساس ہی مر جائے۔ ابنِ صفی کی غم آلود تحریر خوشی کا احساس نہیں چھین لیتی... وہاں سسپنس بھی ہے لیکن قاری کے ذہن پر غیر ضروری بوجھ نہیں کہ قاری خود کو گدھا محسوس کرنے لگے۔ اس کی تحریر میں ہر کیفیت فطری محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ایک کتاب میں عمران بحیثیت ایکسٹو، ایک دروازہ اکھاڑ ڈالتا ہے۔ میں یہ پڑھتے ہی غصّے سے بے قابو ہو جاتا ہوں کہ ابنِ صفی نے یہ کیا مارزن گردی شروع کردی ہے لیکن چند پیراگرافوں کے بعد وہ اپنے ماتحت بلیک زیرو سے کہتا ہے کہ تم نے دروازہ خوب سیٹ کیا تھا، مجھے اُسے اکھاڑنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی... تو سارا غصّہ کافور ہو جاتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اگر ابنِ صفی سامنے ہو تو اس کا قلم چوم لوں اور بس چلے تو ذہن چوم لوں۔"

یہ شاعر جناب رؤف شیخ ہیں جو باقاعدگی سے ابنِ صفی کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔

میں نے رؤف شیخ سے پُوچھا کہ اور کون کون سا ادیب، ابنِ صفی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ہنس کر بولے۔

"یار پڑھتے تو سبھی ہیں۔ کوئی میری طرح اعتراف کر لیتا ہے اور کسی میں اعتراف کرنے کی ہمت نہیں۔ یہ لوگ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے 'لکھاڑی' ہیں، ادیب یا شاعر نہیں۔ اِن کے دماغوں میں جہالت اس قدر بھری ہوئی ہے کہ وہاں شعور کی صاف ہوا کا گزر بھی نہیں۔"

یہ ۱۹۶۷ء کا ذکر ہے... میں، لاہور کے ہنگاموں سے تنگ آکر میاں چنوں کے ایک قریبی گاؤں اقبال نگر میں اپنے ایک دوست کی میزبانی یا مہمانی کی پیشکش قبول کرنے کی اطلاع دینے چلا گیا۔

اقبال نگر، پاک پنجاب کے پہلے وزیرِاعظم نواب افتخار خان ممدوٹ کی ملکیت تھا اور اس علاقے کی بڑی منڈیوں میں سے ایک... اُن دِنوں جب میں اقبال نگر میں تھا تو وہاں سخت گرمی پڑ رہی تھی اور چونکہ گاؤں میں بجلی نہ تھی، اس لیے بجلی کی روشنی اور پنکھے کی نعمت میسّر نہ تھی لیکن اس کے باوجود یہاں جو سکون اور مسرّت حاصل ہُوئی، اس کا الفاظ میں اظہار ممکن نہیں۔

انہی دنوں، میرے میزبان کے ہاں ایک چاند سے بیٹے کی آمد آمد ہُوئی۔ دل کھول کر جشن منایا گیا۔ بزرگ اور نوجوان، نومولود کا نام سوچنے بیٹھ گئے۔ طے یہ ہُوا کہ اپنا اپنا پسندیدہ نام، ایک ایک پرچی پر لکھ کر، نومولود کے دادامیاں کے حوالے کردیں۔ چند لمحوں کے بعد جب پرچیوں کی پڑتال کی گئی تو گیارہ میں سے آٹھ پرچیوں پر "عمران چوہدری" لکھا ہُوا تھا۔ دادامیاں نے پُوچھا: "عمران کا کیا مطلب ہے؟" بچّے کے چچامیاں اور دوسرے ہم خیال بیک آواز بولے۔ "یہ ابنِ صفی سے پُوچھو۔ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اُس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ نام رکھا ہوگا۔" اس نام پر سب کا اتفاق ہو گیا اور حاضرین نے مِل کر دُعا مانگی: "یا اللہ! یہ لڑکا بھی ابنِ صفی کے عمران کی طرح شریف اور بہادر ہو۔ آمین!"

بقیہ تین پرچیوں میں سے ایک پر حمید اور دو پر فریدی کے نام درج تھے۔

لاہور اور کراچی کے درمیان، عوامی ایکسپریس کا سفر اچھا خاصا مسئلہ بن جاتا ہے۔ نشستوں اور برتھ کی ریزرویشن کے بعد، کہیں جا کر سفر کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔

ریلوے ہیڈ کوارٹرز کی عمارت میں واقع ریزرویشن کاؤنٹر پر ایک صاحب، دُنیا و مافیہا سے بے خبر، ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے کتاب کا نام پڑھا... "ڈاکٹر دُعا گو"۔ پڑھتے ہی ایک ترکیب سُوجھ گئی۔ اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا اور وہ صاحب ایک ہاتھ سے نوالے اُٹھا رہے تھے اور دوسرے ہاتھ میں کتاب تھامے، تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑے جا رہے تھے۔

میں نے کھنکار کر انہیں مخاطب کیا تو انہوں نے بیزار کن

نگاہوں سے مجھے گھورا اور کہا۔ "پتہ نہیں، اس وقت 'لنچ بریک' ہے۔" وہ دوبارہ مطالعے میں منہمک ہو گئے۔ میں نے دوبارہ کھنکار کر ادب سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ 'لنچ بریک' ہے۔ اسی لیے حاضر ہُوا ہُوں کہ آپ سے سکون کے ساتھ کچھ گزارش کرسکوں"

اُنہوں نے گھورتے ہُوئے کہا۔ "فرمایئے؟"

"دیکھئے، ایک صاحب ہیں، ابنِ صفی..."

"جی...!" انہوں نے پہلی بار چونک کر کہا۔

"جی ہاں... ہوائی جہاز میں دو روز تک کوئی سیٹ میسّر نہیں اور انہیں ہر حال میں کل دوپہر تک کراچی پہنچنا ہے۔ اس لیے اگر آپ ایک سیٹ اور برتھ کا انتظام کردیں تو نوازش ہوگی۔"

اُنہوں نے جلدی سے کتاب پلٹ کر اس کی پُشت پر چھپی ہُوئی تصویر دیکھی اور بولے۔ "آپ تو ابنِ صفی نہیں ہیں؟"

"جی نہیں... میں، ابنِ صفی ہرگز نہیں ہُوں۔ میں تو اُن کے لیے ٹکٹ لینے آیا ہُوں۔"

اُنہوں نے کچھ سوچا پھر فہرست پر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور پانچ منٹ سے بھی کم وقفے میں سیٹ اور برتھ ریزرویشن کے ساتھ ٹکٹ میرے حوالے کرتے ہُوئے کہا۔ "میرے ایک عزیز کراچی جا رہے تھے میں، اُن کو گھر جا کر منا لوں گا۔ ابنِ صفی کے لیے تو پوری... ٹرین حاضر ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر "ڈاکٹر دُعا گو" میں مصروف ہو گئے۔

زندگی میں پہلی اور آخری بار، ابنِ صفی بن کر ٹرین میں سفر کرنے کا اتفاق ہُوا۔ یہ تو خُدا کا شکر ہے کہ راستے میں کنڈیکٹر گارڈ یا دوسرے حضرات نے "عقیدت" کا مظاہرہ نہیں کیا... ورنہ ابنِ صفی بننا واقعی بڑا مہنگا پڑتا۔

یہ چند واقعات ہیں جنہیں ان سطُور میں پیش کیا گیا ورنہ ایسے واقعات کی تعداد اتنی ہے کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

ابنِ صفی کم از کم تین سو کتابوں، اَن گنت مضامین کے خالق ہیں اور اُن کا عہد، جو حصُولِ آزادی کے بعد شروع ہُوا، تیس سال پر محیط ہے۔

اس دوران میں انہوں نے لاتعداد لوگوں کو متاثر کیا... اور اُن میں سے بعض زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ملے اور اُن کی اپنی اپنی کہانی تھی۔

ان کے تخلیق کردہ کردار، ہزاروں نہیں بلکہ انسانوں کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب بچپن یا نوجوانی تھی تو سوچ

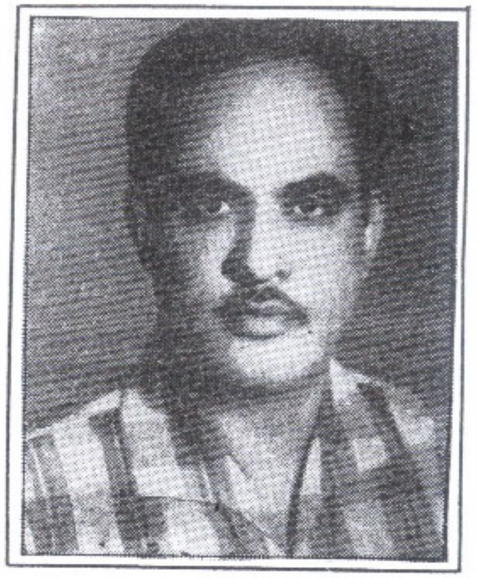

یہ تھی کہ میں، عمران یا فریدی بنوں گا... جب جوانی کے دم خم میں کمی آئی تو اپنے بیٹے میں وہی آئیڈیل جگمگانے لگا۔

بہت کم مصنّف اور بالخصوص اُردو زبان میں، شاذ و نادر ہی کوئی مصنّف ایسا ہو جسے یہ مقبولیت حاصل ہُوئی ہو۔

ان کے کرداروں کے نام، اب زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ لوگ بڑی محبّت اور اُمیدوں کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام عمران رکھتے ہیں... اور اگر یہی حال رہا تو وہ دن دُور نہیں کہ پانچ چھ سال بعد جب پاکستان کے ووٹروں کی فہرست تیار ہوگی تو ان میں چالیس فی صد نام، عمران یا فریدی ہوں گے۔

ابنِ صفی کی تحریروں نے بہت سوں کی زندگی کے رُخ تبدیل کردیے ہیں، اندازِ فکر بدل ڈالا... اور وہ تخریب کی بجائے تعمیر کی طرف مائل ہو گئے... اور اُن کی زندگی جو مایوسیوں کی آماجگاہ تھی، اُمید و عزم کی رزم گاہ بن گئی۔

وہ کوئی ولی اللہ یا مصلحِ قوم نہیں تھے، ایک ادیب تھے... لیکن اُنہوں نے اپنے قلم سے وہ کام کر دکھایا کہ اہلِ قلم کی شان دوچند ہو گئی۔ انہوں نے تحریر کی عظمت کا احساس اُجاگر کیا اور یہ واضح کردیا کہ ادیب کی خودداری اور وقار، دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ وہ قصیدہ نگار اور سرمایہ داروں... اور جاگیرداروں کے خلاف نعرے لگا کر، اُن کی "زکاتِ سرمایہ" پر پلنے والا جوکر نہیں۔ وہ عوام کے احساس اور فکر کی علامت ہے۔ وہ وقت کا نمایندہ اور رُوحِ عصر کا ترجمان ہے۔ وہ لغت کے قبرستان کا مجاور نہیں بلکہ زندگی کا سرچشمہ ہے۔ ابنِ صفی نے لاکھوں دلوں سے مایوسیاں دُور کیں اور انہیں، اُمید کے چراغوں سے منوّر کردیا۔